اسلامی تصوّف کا ارتقاً ---ایک تحقیقی جائزہ

(حصۂ اوّل)

صبیحہ بانو

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک لرننگ

طلوعِ اسلام کے بعد جن علوم نے اسلامی تہذیب کے گہوارے میں پرورش پائی اُن میں علمِ فقہ، علمِ حدیث، علمِ تفسیر، علم الکلام اور علمِ تصوّف نمایاں ہیں۔ ان تمام علوم کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے کیونکہ ان علوم کو قرآن اور حدیثِ رسولؐ کی روشنی میں مرتّب کیا گیا ہے۔ وحی متلو اور وحی غیر متلو کے منبع ہی سے فیض حاصل کر کے علمائے اسلام شریعت، عقائد، احادیث، معانی و مفہومِ قرآن کے عناوین کے تحت کام کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کے روحانی اور عرفانی پہلو پر بھی اپنی اپنی کاوشیں بروئے کار لائے۔ قرآنِ حکیم تمام علوم کا خزانہ ہے اور حضورِ اکرمؐ اس کے شارح اور مفسّرِ اوّل ہیں۔ آپؐ نے قرآن کے ہر پہلو کو وضاحت کے ساتھ اُمت کو سمجھایا اور یہ ہدایت ہمیں احادیث میں بھی ملتی ہے۔ قرآن کی جن آیات کا تعلق انسان کے باطن اور تعلق باللہ سے ہے اور احادیث کی جو وضاحت ہمیں ان آیات کے بارے میں ملتی ہے، ان کی روشنی میں مسلمانوں کے جس طبقہ نے عملاً اور تحریراً کام کر کے دکھایا وہ صوفیائے کرام کا گروہ ہے۔ حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ کے دوران صحابیت کا شرف اتنا عظیم الشان تھا کہ کسی اور اصطلاح کی ضرورت نہیں تھی جو علماً کے تخصص کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی۔ فقہاً، محدثین، مفسرین، مجتہدین اور صوفیاً جیسے الفاظ بعد میں آنے والے تابعین اور تبع تابعین کے لیے استعمال ہوئے، جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ کار میں تخصص اختیار کیا۔ علوم کے ارتقاً کے سلسلے میں یہ کیفیتیں اور حوالے تہذیبوں کی تاریخ میں فطری مقام رکھتے ہیں۔

قلبِ انسانی اور حقیقتِ اعلیٰ کی تلاش

وجودِ انسانی میں قلب ایک ایسا مقام ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کی صحتِ مجموعی کا دارومدار قلب کی صحت پر ہے۔ یہی قلب روحانی تجربات کی گزرگاہ ہے اسی لیے اُنہیں ''وارداتِ قلبی'' کہا جاتا ہے۔

قلبِ انسانی عشق کی آماجگاہ ہے، جمالِ مطلق سے عشق اور فطرتِ انسانی کے اس پہلو پر سب کے خیالات ایک

جیسے ہیں چاہے وہ ہندوستان ہو یا ایران، مشرق ہو یا مغرب اور ایسا لگتا ہے کہ ذہنِ انسانی اپنی اس آفاقی منزل تک پہنچنے کی آرزو میں عشق کے بنیادی اور عمومی اصول پر کام کرتا ہے۔ جمالِ مطلق کے عشق کے احساس کی آگ مشرق و مغرب، مسلمان اور غیر مسلم کے فرق کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ تمام صوفی چاہے وہ ہندوستان اور ایران میں ہوں یا عرب، چین یورپ یا ایشیا میں سب ایک ہی نغمۂ عشق گنگناتے ہیں۔ تفصیلات میں فرق ہوسکتا ہے، اظہار و بیان مختلف ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی اصول میں سب ایک سمندر کے قطروں کی طرح متحد ہیں۔ یہ سب اللہ کے مشتاق ہیں۔ اس تک جانے کے راستے بہت سے ہیں لیکن وہ ایک ہے، اس لیے بقول مولانا روم اگر کوئی خلوصِ دل سے اسے پانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے مل جاتا ہے۔(۱)

حقیقتِ اعلیٰ کی تلاش انسان کو ازل سے رہی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بہت واضح طور پر یہ اصول موجود ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا. (۲)

ترجمہ: ''اور جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے ہم انہیں اپنے راستے ضرور دکھائیں گے''

''جاھدوا'' کا مادہ ''جھد'' ہے جس کا مطلب ہے سر توڑ کوشش کرنا یعنی اپنی استطاعت کے مطابق اپنی کوششوں کو آخری حدوں تک لے جانا۔ طول تاریخ میں ہم نے دیکھا کہ تہذیب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ حقیقت اعلیٰ تک رسائی کے حوالے سے بھی انسان مختلف ادوار سے گزرتا رہا۔ یہ تلاش کبھی سرد نہیں پڑی، ہاں مختلف معاشروں میں سرزمین، ماحول، ثقافت، افراد کی افتادِ طبع، حکومت و ریاست اور جغرافیائی پابندیوں کے باعث اس تلاش کی سرگرمیوں میں تنوع پایا جاتا ہے۔ کہیں مظاہر فطرت کو ہی جمالِ مطلق کا عکس تصور کیا گیا مثلاً چین کے وسیع و عریض جغرافیے میں طوفان، اژدھے، درخت، سورج، دریا، طغیانی، ابر و باراں اور سرسبز میدانوں پر اہل دل کی توجہات مبذول رہیں اور خدائے واحد کے تصور سے محروم ہونے کے باوجود یہ معاشرہ عقل و دانش اور معرفت کے سفر میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ اس حوالے سے کنفیوشس کا ذکر کیا جاتا ہے اور علم حاصل کرنے کی تاکید کرتے ہوئے احادیث میں چین کا لفظ ادا ہوا جو اپنے پہلو میں بہت سے اسرار لیے ہوئے ہے۔

برِصغیر میں یہ تلاش مختلف قسم کی تھی۔ اسلام کی آمد سے قبل ہندو مذہبی ادب کے مطالعے سے ہمیں جمال مطلق کی آرزو کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مغرب میں حضرت عیسیٰؑ کے (بظاہر) مصلوب ہو جانے کے بعد، الوہی ہدایت سے روگردانی اور اس جرم کے احساس نے روحانیت کے متلاشی راہبوں کو جنگلوں میں سرگردان و پریشان بھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ عرب میں بھی زمانہ فترت میں یہ چراغ ٹمٹماتا رہا لیکن ان لوگوں سے یہ عرصہ بھی خالی نہیں جو اپنے مبداء و منزل کی تلاش میں مصروف تھے۔ اس زمانہ میں کاہنوں اور نجومیوں کی کثرت تھی جو عوام الناس کے ذوقِ حقیقت طلبی سے خوب خوب فائدہ

اٹھاتے تھے۔ کرہِ ارض کے ہر علاقے میں یہ سفر اپنے اپنے انداز سے جاری رہا۔

ایم اے شستری لکھتے ہیں: ''جو کچھ رومی نے ایران میں کہا۔ سنکارا نے اس کا اظہار ہندوستان میں کیا اور بعینہٖ یہی یورپیوں کے ذہن میں تھا۔ یہ اس عہد کا اثر تھا جو ہر جگہ ایک ہی قسم کی بنیادوں پر کام کر رہا تھا۔ ہندوستان کے سادھوؤں کے افکار کے مطابق ہر عہد کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں جو کسی ایک ملک یا براعظم تک محدود نہیں رہتیں بلکہ ابر باراں کی مانند بلاتفریق ہر مقام کو سیراب کرتی ہیں۔ یہ تمام دنیا میں یکساں ہوتی ہیں۔ ان کی تعداد میں کمی بیشی کی وجہ مختلف سرزمینوں کی مٹی کی خصوصیت، اور لوگوں کی استعداد میں اختلاف ہے۔ ذہنِ انسانی ہر عہد کے زیرِ اثر ایک ہی جہت میں کام کرتا ہے، جو اس باطنی رشتہ کی طرف اشارہ ہے جو تمام انسانوں کے درمیان موجود ہے۔ وجہ نامعلوم ہے لیکن نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ تفصیلات اظہار اور قوت میں کچھ فرق ہوسکتا ہے لیکن جذبہ ایک ہی ہے۔ اختلاف کی وجہ بھی ہر قوم کے سماجی، مذہبی، سیاسی، اخلاقی ارتقاء اور ان کی عقلائی ترقی کے معیار پر منحصر ہے۔.....صوفیائے اسلام، ہندوستان کے سادھو اور یورپ کے راہب آٹھویں اور پندرویں صدی عیسوی کے درمیان تصوف کی بساط کے بچھانے اور اس کے درہم برہم ہوجانے کے حوالے سے کائنات کی ایک اکائی رہے ہیں۔''(۳)

اسلامی تصوّف اور مختلف ادوار

جہاں تک صوفیائے اسلام کا تعلق ہے ان کی تاریخ کو مندرجہ ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ زاہدانہ طرزِ حیات۔ ۲۔ نظریاتی ارتقاء۔ ۳۔ منظم سلاسل ہائے طریقت۔

۴۔ زوال۔(۴)

زاہدانہ طرزِ حیات ۔ صوفیائے متقدمین

دورِ اول حضورؐ کی رحلت سے شروع ہوکر عباسیوں کے دورِ حکومت پر ختم ہوگیا۔

پیغمبرِ اکرمؐ کی نورانی صحبت کا شرف پانے والے لوگ ایک ایسی جماعت کو تشکیل دینے میں کامیاب رہے جو تاریخِ انسانی کی پاکیزہ ترین جماعتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اکثر صحابہ کرام زہد و تقویٰ کی اعلیٰ ترین منزلوں پر فائز تھے۔ نبی آخرالزماں کی قیادت میں انہوں نے تاریخِ اسلام کے وہ ہیجان انگیز شب و روز گزارے جن میں غزوات بھی لڑی گئیں، صلح نامے بھی لکھے گئے، دشمنوں کی سازشوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، وہ منافقوں کی چیرہ دستیاں بھی برداشت کرتے رہے اور شمعِ رسالت کے گرد پروانہ وار طواف کرتے رہے۔

عشقِ حقیقی سے سرشار صحابہ قرآن کی تلاوت میں راتیں گزارتے اور دن کو شیروں کی طرح گرجتے دھاڑتے جنگ میں حصہ لیتے تھے۔ حضورؐ نے اپنے متقی اور پرہیزگار صحابہ کی قدم قدم پر حوصلہ افزائی فرمائی ہر نیک عمل کو سراہا اور

بشارتوں سے بھی نوازتے رہے۔ قرآن نے آپ کو رحمت للعالمین کا لقب دیا۔ آپؐ کے حیات طیبہ کے دوران زہد و تقویٰ کا ایسا معیار قائم ہو گیا تھا کہ آپؐ کے حیات ظاہری سے پردہ فرما لینے کے بعد بھی صحابہ اسی معیار کو اپنے سامنے رکھتے تھے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ جن کی پرورش خود آپؐ نے فرمائی تھی اور جن کی فضیلت میں متفقہ علیہ احادیث کا ذخیرہ تاریخ میں محفوظ ہے، مسلمانوں کے لیے ایک ایسا دروازہ تھے جس کے ذریعے علومِ نبویؐ تک رسائی ممکن تھی۔

حضرت علیؓ اور اہل بیتؑ کی موجودگی میں زاہدانہ طرزِ حیات معاشرے کا اعلیٰ ترین معیار بن گیا تھا اور ہر شخص ایک متقی شخص کو عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا گویا دنیاوی زندگی ہوا و ہوس سے پاک ہونے لگی اور بنی نوع انسان کی اعلیٰ تر صلاحیتوں کی آبیاری کا آغاز ہو گیا۔

خلافتِ راشدہ کا سورج غروب ہونے کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور دارالحکومت مدینہ سے شام منتقل کر دیا گیا تو متقی اور پرہیزگار مسلمانوں کو نوشتۂ دیوار نظر آنے لگا۔ گاہے گاہے معاویہ کوئی کی گئی نصیحتیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ ابودرداء، عبادہ ابن صامت، عبدالرحمٰن ابن سہیل انصاری، سعد ابن ابی وقاص اور ابوذر غفاری نے حسبِ موقعہ معاویہ کو ٹوکا اور اس کی دنیا پرستی کی مذمت کی (۵) اور سب سے بڑھ کر حضرت علیؓ نے معاویہ کو نصیحتیں کیں، اس کو خطوط بھیجتے رہے اور خطبات کے ذریعے بھی ہدایت کا فریضہ انجام دیا۔ (۶)

صلح نامہ کو اپنی عیاری کے قدموں تلے روند ڈالنے کے بعد معاویہ نے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ تاریکی کے اس دور میں مسلمان خوفزدہ تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بہت سے دنیا پرستوں نے آیات الٰہی کو سستے داموں فروخت کر ڈالا ہے اس زمانے کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے اے جے آربری لکھتا ہے: ''ایسے حالات میں مذہبی لوگوں کے لیے اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ تباہی کے راستے پر رواں اس معاشرے سے خود کو علیٰحدہ کر کے گوشہ نشینی اختیار کریں۔ بہت سے صحابہ جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کا دیدار کیا ہوا تھا۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں یہ دیکھنے پر مجبور تھے اور ان کے لیے صرف یہ راہ رہ گئی تھی کہ وہ اعلیٰ مقامات پر ان سب بدعنوانیوں کے حوالے سے اپنے خوف و دہشت کا اظہار کریں۔ یہ مومنین اپنے تقویٰ اور پرہیزگاری میں اس قدر استقامت رکھتے تھے کہ انہیں ان حالات و واقعات کی مذمت کرنے اور حکمرانوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرانے میں کوئی ڈر یا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اور پرہیزگار حلقوں کے لیے یہ ایک مستند اور پسندیدہ طریقہ بن گیا تھا کہ وہ ان بزرگ صحابہ کے فصیح و بلیغ خطبات سننے کے لیے جمع ہوں۔'' ..... اسی صفحے پر آگے چل کر مصنف لکھتا ہے کہ ..... ''عمر بن عبدالعزیز اموی خلفاء میں ایک ایسا خلیفہ گزرا ہے جو نہ صرف خود ایک نیک اور پرہیزگار انسان تھا بلکہ اس کا رابطہ حسن بصری (م ۱۱۰ھ۔ ۷۳۸ء) سے بھی تھا۔ حسن بصری کے بارے میں وہ

لکھتا ہے کہ ایک ممتاز عالم تھا اور جس کو صوفی اپنا اولین مرشد تسلیم کرتے ہیں اور حسن بصری کے ملفوظات اوائلِ زمانہ کے صوفیانہ افکار کی عکاسی کرتے ہیں لیکن یہ افکار آگے چل کر بہت ترقی نہ پا سکے۔''(۷)

اگرچہ صوفی کا لفظ ابو ہاشم کوفی کے لیے سب سے پہلے استعمال کیا گیا جو دوسری صدی میں گزرے ہیں اور جو سفیان ثوری کے استاد تھے لیکن کچھ صحابہ روحانی زندگی سے بھی مالا مال تھے یہ بھی سب ایک درجے پر نہیں تھے یہاں تک کہ حضرت سلمان فارسی اور ابوذر غفاری بھی ایمان کے ایک درجے پر نہیں تھے۔(۸)

کشف المحجوب میں جناب علی ہجویری نے آئمہ طریقت کا ذکر کرتے ہوئے آئمہ اہلِ بیت کا ذکر کیا ہے۔(۹) حضرت علیؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام محمد باقرؒ اور حضرت امام جعفر صادقؒ کو اہلِ تصوف اپنے آئمۂ اوّلین میں شمار کرتے ہیں اور تمام سلاسل ہائے طریقت آخر کار اسی نورانی سلسلۂ نسب پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ آئمۂ اہلِ بیت کے کردار و افعال سب پر عیاں ہیں۔ عبادت میں، حسنِ خلق میں، شفقت و محبت میں یہ درجۂ کمال پر ہیں۔ یہ حقیقتِ محمدیہ کی شمع کی مختلف کرنیں ہیں جن میں سے ایک کا کردار دوسرے کے کردار کا پرتو ہے۔ جس میں حیاتِ انسانی کے اعلیٰ ترین معیارات کا عکس نظر آتا ہے۔ حضورؐ کی احادیثِ مبارکہ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپؐ نے اپنے بعد آنے والے آئمہ کے بارے میں صریحاً ارشاد فرما دیا تھا۔ اور امام الانبیاء امام الائمہ کی حیثیت سے حضرت محمدؐ ختمی مرتبت نے ان کے کردار کے بارے میں بھی جابہ جا احادیث ارشاد فرمائی ہیں۔

اہل بیت کا کردار روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے اور بنی نوع انسان کی سیاہ بختی اور خوش بختی کے ملے جلے اس دور میں یہ روشنی خوش آیند مستقبل کی نوید سنا رہی ہے۔

این میری شمل اپنی کتاب Mystical Dimensions of Islam میں مسلمانوں میں تصوّف کے آغاز کے بارے میں لکھتی ہیں:

اسلام میں زاہدانہ طرزِ حیات کے اولین مظاہر کے بارے میں ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ لیکن جب ۶۶۱ عیسوی میں چوتھے خلیفہ حضرت علیؑ کو قتل کر دیا گیا اور بنی امیہ حکومت میں آئے تو معاشرے میں مختلف نظریات سامنے آئے جو بہت نمایاں ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھے جب خلافت نے ملوکیت کی شکل اختیار کر لی۔ جبر و استبداد کے زیر اثر معاشرہ کی دینی قوتوں کو مضمحل کر دیا گیا تھا متقی پرہیزگار مسلمان بادشاہ کے خوف سے خاموش تھے۔ مفتی بادشاہ کی خواہش پر فتوے دینے لگے تھے یہاں تک کہ امام حسینؑ کے قتل پر بھی راضی ہو گئے۔(۱۰)

اسی عہد کے بارے میں اہلِ تصوّف کے حوالے سے این میری شمل لکھتی ہیں:

''حکومتِ وقت کے خلاف زاہدانہ طرزِ زندگی کے علمبردار کی حیثیت سے اسلامی تصوّف جو نام رہبر کی

حیثیت سے سامنے آیا وہ حسن بصری (م ۷۲۸ء) کا تھا۔ انہوں نے عربوں کے عروج کا وہ عظیم الشان زمانہ دیکھا تھا جب ۷۱۱ء میں انہوں نے جبرالٹر (جس میں آج مسلمان فاتح طارق کے نام پر کوہِ طارق موجود ہے) اور وادیٔ سندھ کے زیریں علاقے میں قدم رکھا اور اس میں مسلمان ریاست کی بنیاد ڈالی جو آج بھی موجودہ پاکستان میں موجود ہے۔ اسی سال (۷۱۱ء) مسلمان قسطنطنیہ پہنچے جو اسلامی علوم اور زہد و تقویٰ کا اہم گہوارہ بننے والا تھا۔'' (۱۱)

حسن بصری

حسن بصری ترکِ لذات اور ترکِ دنیا کے داعی تھے۔ انہوں نے دنیا کو سانپ سے تشبیہ دی جو دیکھنے میں خوبصورت چھونے میں نرم ہوتی ہے لیکن اس کا زہر خطرناک ہوتا ہے۔ انہوں نے زہد کو پیغمبروں کی صفت قرار دیا اور دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی پر زور دیا اس کے فریب سے بچنے کی تلقین کی اور اپنا دل آخرت سے لگانے کی ترغیب دی۔ مصیبتوں کو نصیحت سمجھا۔ شکم سیری کو کمزوری گردانا اور بھوک کو نورانی قوت کا ذریعہ سمجھا۔

اس عہد میں اسلامی تصوف کی عمارت کی بنیاد رکھی جارہی تھی اور یہ بنیاد ترکِ دنیا اور زہد پر رکھی گئی۔ یہ ردِعمل ہوسکتا ہے ملوکیت کے غلبہ کا اور ان حالات کا جن کے تحت معاشرے میں اس قدر تاریکی اور سیاہ بختی پھیل گئی کہ خدا ترس مسلمان منتظر رہتے تھے کہ آسمان سے پتھر برسیں گے اور عذابِ الٰہی نازل ہوگا۔ بنی امیہ کی سلطنت کے اولین دور میں معاویہ اور اس کے بعد یزید کے دورِ حکومت میں کربلا میں خانوادۂ رسالتؐ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تاریخ کو ہمیشہ ماتم گزار رکھنے کے لیے کافی ہے اور اہلِ دل اس پر اشکبار رہیں گے۔ صوفیوں نے زہد میں پناہ ڈھونڈی۔

؎ شیخ پڑے محرابِ حرم میں پہروں پڑھتے دوگانہ ہیں سجدہ وہ بھی تیغ تلے کا اُن سے ہو تو سلام کریں

علم الکلام کی طرح اس اصطلاحی عرفان کی تاریخ بھی حسن بصری (وفات ۱۱۰ھ) سے شروع ہوتی ہے۔ صوفی کے بعض سلسلے حسن بصری کے واسطے سے خود کو امیر المومنینؑ تک پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح ابن ندیم اپنی الفہرست کے پانچویں مقالے کے پانچویں فن میں ابو محمد جعفری خلای کے سلسلے کو حسن بصری سے ملاتے ہوئے کہتے ہیں: حسن بصری نے اصحاب بدر میں سے ستر افراد کو دیکھا ہے۔ (۱۲)

حسن بصری نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ پہلی صدی ہجری میں گزارا۔ یہ ۲۲ھ میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۸۸ سال کی عمر پائی۔ حسن بصری صوفی نہیں کہلاتے تھے۔ ان کا شمار صوفیہ میں اس لیے ہوتا ہے کہ انہوں نے ''رعایۃ حقوق اللہ'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جو تصوف پر پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کا واحد نسخہ آکسفورڈ کی لائبریری میں ہے۔ نکلسن کہتا ہے۔ حسن بصری پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے صوفی طریقۂ زندگی کے بارے میں لکھا۔ مقامات عالیہ تک

پہنچنے کے لیے تصوف کا جو طریقہ بعد کے مصنفین نے تجویز کیا وہ ہے اول توبہ اور اس کے بعد مختلف دوسرے اعمال جن میں سے ہر عمل ایک مقام سے دوسرے بالاتر مقام تک پہنچنے کے لیے کیا جاتا ہے۔(۱۳)

حسن بصری کے بارے میں علی ہجویری کشف المحجوب میں رقم طراز ہیں: ''اہلِ طریقت کے نزدیک آپ بڑے جلیل القدر ولی اللہ ہوئے ہیں اور آپ کے اقوال بہت بلند ہیں۔''(۱۴) اے ایم شستری لکھتے ہیں:

''نکلسن نے The Idea of Personality in Sufisim میں لکھا ہے۔ حسن بصری کا زہد وتقویٰ مشہور ہے۔ ان کا توکل، نکلسن لکھتا ہے، اتنا ہی حقیقی تھا جتنا وہ خوف جس نے توکل کو جنم دیا تھا۔ ان لوگوں کا حال سن کر جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ہزار سال جہنم میں گزار کر نجات حاصل کریں گے، وہ رونے لگے اور کہنے لگے آہ کیا میں بھی انہی لوگوں میں سے ہوں۔''(۱۵)

حضورؐ کے وجودِ مبارک کے ساتھ صوفیا کے سلسلے میں مندرجہ ذیل انداز میں مربوط کیا گیا ہے:

رسولِ خدا حضرت محمدؐ	علی (م ۶۶۱ء)	
حسن بصری (م ۷۲۸ء)		حبیب عجمی (م ۷۳۷ء)
داؤد طائی (م ۷۸۱ء)	معروف کرخی (م ۸۱۵ء)	سری سقطی (م ۸۶۷ء)
جنید بغدادی (م ۹۰۹ء)	مرتعش بغدادی (م ۹۳۹ء)	ابونصر سراج طوسی (م ۹۸۸ء)
ابوالفضل حسن سرخ	ابوسعید ابن ابی الخیر (۱۶)	

''اس قسم کی فہرست کے شروع میں محمدؐ اور ان کے داماد کا ذکر اسلام میں تصوف کے وجود کے تصور کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صوفی پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات کے جائز وارث ہیں اور زاہدانہ زندگی کے صحیح نمائندے ہیں۔ حسن بصری، حبیب عجمی اور داؤد طائی صوفی کے بجائے زاہد اور گوشہ نشین تھے اگرچہ ہم نویں صدی کو نکتہ آغاز بھی سمجھیں تو بھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ (تصوف کے حوالے سے) کوئی خاص لائحہ عمل (ان صوفیا تک) پہنچا۔ اس قسم کا کوئی نظریہ تصوف کی ماہیت کے لیے نیا تھا، جو کہ ایسا نظام ہے جو کسی سند یا روایت پر مبنی نہیں، بلکہ ایک آزادانہ تحریک ہے جو لامتناہی صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ تاکہ کوئی بھی شخص اپنی روحانی تشنگی بجھانے کے لیے اپنے دل کی آواز پر عمل کر سکے۔ ابوسعید کے عہد سے قبل چند ممتاز علما مثلاً جنید ایسے مدارس قائم کر چکے تھے جو متنازعہ حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی یہ متنازعہ حیثیت تصوف کے نظریات اور عمل کے حوالے سے تھی جب کہ بعد کے دور میں عیسائی راہبانہ نظام کے مقابلہ میں تصوف نے عظیم تنظیمی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ہمیں ہر جانب مختلف طور طریقے نظر آتے ہیں جو اپنی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور آزادی سے۔ ایک فعال، زندگی کو تشکیل دیتے

ہیں۔''(۱۷)

زاہدانہ زندگی کے بعد مسلمانوں میں تصوف کا دوسرا دور نظریاتی ارتقاء کا تھا۔جس کے ساتھ ساتھ سلاسل ہائے طریقت منظرِ عام پر آئے اس کے بعد زوال کا سلسلہ شروع ہوا۔

ایرانی عرفاً

ایرانی عرفاء میں حبیب عجمی، ابراہیم ادھم، شفیق بلخی، فضیل بن عیاض، احمل بن خزروی، ابوعلی سقیق، حاتم عصام، معروف کرخی، ابوالحسین نوری خراسانی، بشر حافی، یحییٰ بن معاذ بلخی، بایزید بسطامی، سیری سقطی، سہیل ابن عبداللہ شستری، جنید نہاوندی، ابوبکر شبلی خراسانی، ابوعلی رود، ابونصر سراج طوسی، ابوالفضل سرخسی، ابوسعید ابوالخیر نیشاپوری، ابوعلی دقاق نیشاپوری، عین القضاۃ ھمدانی، احمد جامی، حافظ شیرازی، ضائن الدین علی ترکہ اصفہانی، شمس الدین محمد لاھجی نوربخشی، نورالدین عبدالرحمٰن جامی شامل ہیں۔(۱۸)

دوسرے علاقوں کے صوفیاً

متاخرین سے قبل ہونے والے صوفیاً کا تعلق تبع تابعین کے گروہ سے تھا۔ان کا ذکر بھی علی ہجویری نے کیا ہے۔(۱۹)ان کے علاوہ آئمہ متاخرین کے اسمائے گرامی بھی کشف المحجوب میں ملتے ہیں۔(۲۰)

اسلامی تصوف میں ملفوظات کی ابتدا سادہ تصانیف سے ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ یہ حکیمانہ افکار وآراء سے ہمکنا ہوتی گئیں۔تیسری صدی ہجری کے اواخر تک ہمیں صوفیائے متقدمین کی جن کتب درسائل کا ذکر ملتا ہے وہ سب عربی میں ہیں۔

یہ وہ تحریریں ہیں جن کا تعلق تصوف سے ہے۔ان کا موضوع تصوف ہے اوران کا ذکر ابن ندیم نے الفہرست میں کیا ہے۔یہ وہ کتابیں ہیں جن کی تحریریں سادہ ہیں ان میں تمام تر تعلیمات طالبانِ طریقت اور مریدانِ راہِ سلوک کی راہنمائی اور ہدایت پر مبنی ہیں۔تاریخ تصوف اور اسرار ورموزِ تصوف ان کا موضوع نہیں ہے۔البتہ ان میں محبتِ الٰہی، قربِ الٰہی اوراس کی منزلوں کا ذکر ہے۔یہ تحریریں آیاتِ قرآنی، احادیث نبوی، اخبار، صوفیانہ تفاسیر اور ایسی توضیحات پر مشتمل ہیں جو ایک صوفی کی تربیت اور سیر وسلوک کی اصلاح کے لیے ضروری تصور کی جاتی ہیں اور صوفیائے متقدمین کے مریدوں نے انہیں کی روشنی میں سلوک کے مدارج اور منازل طے کیے۔ان تحریروں میں علمی مسائل کے ساتھ اخلاقِ حسنہ پر بحث کرتے ہوئے صوفیانہ مجاہدات، مقامات، احوال، کرامات اور خرقِ عادت کے تذکرے بھی ہیں۔مختصر یہ کہ صوفیائے متقدمین کی تحریروں مین ایسے پندونصائح اور حکم وامثال جمع کردیئے گئے ہیں جن کی تائید نصوصِ قرآنی اور احادیث نبوی سے ہوتی ہے۔جب کہ اس کے بعد کا دور صوفیائے متاخرین کا دور ہے۔علمی تصانیف کا دور ہے جس میں تصوف کو ایک

نظریہ اور فکری رجحان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ابتداء میں صوفیہ کے یہاں تصوف کا مضمون سادہ تھا۔ دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے اور حضورؐ اور بزرگان دین کی پیروی سے آگے نہ بڑھا تھا۔ یہ باتیں آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتی گئیں اور افراط ومبالغے تک پہنچ گئیں۔ مرور ایام سے متاعِ ذوق میں اضافہ ہوا اور تصوف میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور صوفیاء نے مختلف سرچشموں سے بہت سی باتیں مستعار لیں اور ان میں اضافہ بھی کیا۔ (۲۱)

خواتین صوفیاً

رابعہ بصری (۹۷۔۱۸۵ھ) پہلی خاتون ہیں جن کو تصوّف کے حوالے سے شہرت ملی۔ ایک بار بصرہ میں شدید قحط پڑا تو آپ کے رشتہ داروں نے آپ کو عتیق نامی ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ دور غلامی میں آپ کی روحانیت کے اصرار کھلے۔ دن بھر محنت کرنے کے بعد آپ رات کو نماز میں مشغول رہتیں۔ بچپن کے دن اور غلامی کی تکلیفیں اور عبادتیں یہ سب ریاضتیں ہی تھیں جنہوں نے رابعہ بصری کو آسمانِ تصوف کا جگمگا تا ستارہ بنایا۔ رابعہ بصری کے مسلک کی بنیاد عشقِ الٰہی پر ہے۔ اس سلسلے میں ایک محقق عبدالرزاق پاشا کہتے ہیں۔ حضرت رابعہ بصری کی حیاتِ مبارک میں حزن والم کے جو گہرے نقوش پائے جاتے ہیں اگر انہیں غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہو گی کہ یہ تمام تر اسی محبت کا نتیجہ ہے جو حضرت رابعہ بصری کو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک سے تھی۔ (۲۲) رابعہ بصری عشقِ الٰہی میں اس قدر غرق رہتی تھیں کہ خوشی اور غم اپنی حیثیت کھو بیٹھے تھے۔ عبادت کے بارے میں آپ کا طرزِ فکر بڑا عجیب تھا آپ خوف اور طمع سے بے نیاز ہو کر اپنے خالق کو پکارتی تھیں۔ (۲۳)

لطیف اللہ اپنی کتاب تصوّف اور سرّیت میں ڈاکٹر مصطفیٰ حلمی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں:

''دوسری صدی ہجری میں ہم ایک اور مکتبِ خیال کو ابھرتے اور نمایاں ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور وہ یہ کہ زہد میں محبت کی آمیزش شروع ہوئی اس اہم اصول کو رابعہ عدویہ (م ۱۸۵ھ) نے ایجاد کیا۔ اس محبت کی اصل یہ تھی کہ خوفِ جہنم اور طمعِ جنت سے بے نیاز ہو کر خدا کو اس لیے یاد کیا جائے کہ وہ خدا ہے۔ اس کی ذات سے بے انتہا اور والہانہ محبت کی جائے۔ یہ محبت کسی دوسرے جذبے کے تابع نہ ہو۔'' (۲۴)

ڈاکٹر مصطفیٰ حلمی نے شاید باب مکتبِ اہلِ بیتؑ کے افکار وخیالات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ یہ بات نہ لکھتے کہ یہ آزادانہ محبت الٰہی رابعہ عدویہ کی ایجاد کردہ ہے۔ یہ اقوال آئمۂ اہلِ بیتؑ سے منسوب ہیں کہ میں نے خدا کی عبادت اس لیے نہیں کی کہ مجھے جہنم کا خوف یا جنت کی لالچ ہے، یہ تو غلاموں کی عبادت ہے۔ میں خدا کی عبادت اس لیے کرتا ہوں کہ اس کو عبادت کے لائق پاتا ہوں۔ یہ آزاد بندوں کی عبادت ہے۔ (۲۵)

بہر حال زاہدانہ زندگی میں محبت اور عشقِ الٰہی کی آمیزش صوفیائے متقدمین کے دور ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا نئے نئے زاویہ ہائے نظر سامنے آتے رہے اور محبتِ الٰہی کی آتشِ شوق انفاس العارفین کی لو کو تیز کرتی گئی اور اس کی حدت ان کے ملفوظات میں محسوس کی جاتی رہی۔ تصانیف کے حوالے سے صوفیائے متاخرین کا دور بہت زرخیز رہا اس دور میں تصوف کو عروج حاصل ہوا۔

نظریاتی ارتقاء۔ صوفیائے متاخرین

صوفیائے متاخرین کی تحریروں کی اساسی حیثیت وہی تھی جو دورِ اول کے صوفیاء کی تحریروں کی تھی لیکن یہاں ہمیں محبت کے اضافے کے ساتھ ساتھ فلسفہ وحکمت اور نیرنگی خیال نظر آتی ہے۔ یہ دور تیسری صدی کے آخری ربع سے شروع ہوتا ہے اور یہ وہ دور ہے جس میں عالم اسلام میں تصوف کے بارے میں خوب لکھا گیا ہے۔ چند اہم کتب کے نام درج ذیل ہیں:

کتاب کا نام	مصنف
کتاب الصدق	حضرت ابوسعید فراز (م ۲۸۶ھ)
کتاب الرعایۃ	حارث المحاسبی (۱۶۵ تا ۲۴۳ھ)
کتاب اللمع فی التصوف	شیخ ابونصر عبداللہ سراج طوسی (م ۹۸۸ھ)
کتاب التعرف	شیخ ابوبکر بخاری (م ۱۰۰۰ھ)
قوت القلوب	شیخ ابوطالب مکی (م ۹۹۶ھ)
حلیۃ الاولیاء	شیخ ابونعیم بن عبداللہ (م ۱۰۳۸ء)
رسالہ قشیریہ	شیخ ابوالقاسم قشیری (م ۱۰۷۲ء)
کشف المحجوب	شیخ ابوالحسن علی ہجویری (م ۱۰۷۲ء اور ۱۰۷۹ء کے درمیان)
منازل السائرین	خواجہ عبداللہ انصاری ہروی (۱۰۰۶ء تا ۱۰۸۸ء)
احیاء العلوم	شیخ ابوحامد غزالی (م ۱۱۱۱ء)
فتوح الغیب غنیۃ الطالبین الفتوح الربانی	عبدالقادر جیلانی (م ۱۱۶۶ء)
تذکرۃ الاولیا	شیخ فریدالدین عطار (۱۱۲۰ء۔۱۲۲۰ء)

عوارف المعارف	شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۱۲۳۴ء)
نفحات الانس	جامی (م ۸۹۸ھ)
طبقات الصوفیہ	السلیمی (م ۴۱۲ھ)
کتاب التصریف	الکلاباذی (م ۴۱۲ھ)
فتوحات مکیہ فصوص الحکم	شیخ محی الدین اکبر ابن العربی (۱۱۶۵ء تا ۱۲۴۰ء)
فیہ مافیہ، مثنوی معنوی	جلال الدین رومی (۱۲۰۷ تا ۱۲۷۳ء)
نغمات الانس	شیخ نور الدین جامی (۱۲۰۷ تا ۱۲۷۳ء)
مکتوبات	شیخ احمد مجدد الف ثانی (۱۵۶۴ تا ۱۶۲۴ء)
ارشاد الطالبین	عبد الرشید اخوند درویزہ (م ۱۰۷۲ء)
دیوان	عبد الرحمٰن مہمند رحمان بابا (۱۶۵۳ء تا ۱۷۱۱ء)
فوائد الفوائد	نظام الدین اولیاء (۱۲۸۳ء تا ۱۳۲۵ء)
عقائد المومنین	عبد الحق ثانی پیر مانکی شریف (م ۱۳۲۲ھ)
سفینۃ الاولیاً	داراشکوہ (م ۱۰۶۹ھ)

اگر چہ یہ تمام کتب اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں تاہم کتاب اللمع فی التصوف، رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب نے تصوف کے نصاب کی حیثیت سے شہرت پائی۔ قوت القلوب کا شمار بھی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ ابن العربی کی فصوص الحکم کے ساتھ اسلامی تصوف نے ایسی ڈگر اختیار کی جس نے اسے اعلیٰ ترین منازل تک پہنچا دیا۔ مثنوی مولانا روم نے وہ شہرت حاصل کی جو کسی اور کتاب کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔ آج اکیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے دانشوروں کا یہ کہنا غلط نہیں کہ رومی آج دنیا کے ہر شہر کا باسی ہے۔ عالمگیر معاشرے میں مثنوی مولانا روم کو جو پذیرائی حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ نجی محفلوں سے لے کر تعلیمی اداروں تک مثنوی کے چرچے ہیں اور اس کی دلکش کہانیاں ذہن و روح پر ایسا اثر چھوڑتی ہیں جو فطرت انسانی کے اندر پہنچ کر جذب ہو جاتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد کے دور میں تو رومی سب کو اور زیادہ محبوب ہو گئے ہیں کیونکہ انہوں نے انسان کو مشینوں کی بے جان صحبت سے نکال کر زندگی کے اعلیٰ تر مقاصد کی طرف توجہ دلائی ہے۔ تخلیق کی ہر سطح سے مکالمہ کر کے رومی نے زندگی کی حرارت کو از سر نو زندہ کیا ہے۔ UNESCO نے

۲۰۰۷ء کو مولانا روم کا سال قرار دیا ہے جس میں ان کی ۸۰۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔

حسن بصری کے بعد زہاد میں حبیب عجمی، داود طائی کے نام آتے ہیں۔ ان کے بعد معروف کرخی ہیں جو آٹھویں امام کے درسے منسلک تھے جن کے دست مبارک پر یہ مسلمان ہوئے۔ این میری شمل معروف کرخی کے بارے میں لکھتی ہیں:

''روایات شاہد ہیں کہ ان کی روحانی قوت بہت اعلیٰ تھی ان کی دعائیں مقبول تھیں اور ان کے انتقال کے بعد بھی بغداد کے لوگ دریائے دجلہ کو پار کر کے ان کے مزار پر بارش کے لیے دعا کے لیے جاتے تھے۔ وہ ان اولین صوفیاء میں سے تھے جنہوں نے عشقِ الٰہی کی بات کی اور ان کی یہ تعلیم کہ عشقِ الٰہی کسبی نہیں ہوتا کیوں یہ ایک الٰہی تحفہ ہے، آنے والے صوفیانہ نظریات پر بہت اثر انداز ہوئی۔ قشیری نے خاص طور پر معروف کرخی کی رضا، کی تعریف کی ہے یعنی رضائے الٰہی پر راضی رہنے کی قوت۔''(۲۶)

معروف کرخی کے سلسلہ کو سلسلۂ ذہب کہتے ہیں۔ (۲۷) کم از کم اس سلسلے کے متوسلین یہی دعویٰ کرتے ہیں۔ سری سقطی معروف کرخی کے شاگرد اور مرید اور جنید بغدادی کے ماموں تھے۔ ان سے توحید اور عشقِ الٰہی کے بارے میں بہت سے اقوال منقول ہیں۔ انہیں کا قول ہے کہ عارف آفتاب کی طرح سارے عالم پر چمکتا ہے اور زمین کی طرح نیک و بد کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا ہے۔ وہ پانی کی طرح ہے جس پر تمام دلوں کی زندگی کا مدار ہے۔ آگ کی طرح اس کی روشنی سب تک پہنچتی ہے۔(۲۸)

بشر حافی (م۲۲۶) اور فضیل بن عیاض شروع میں اہلِ فسق و فجور میں سے تھے بعد میں تائب ہوئے اور ریاضت کر کے عرفان کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے۔ حارث محاسبی (م۲۴۳) کو مراقبہ اور محاسبہ میں کمال حاصل تھا۔ جنید بغدادی (م۳۰۲) ایسے صوفی تھے کہ جذب و کیف کی انتہائی منازل طے کرنے کے بعد بھی اپنے ہوش و حواس میں رہتے تھے۔ جنید بغدادی کو صوفیاً سید الطائفہ کہتے ہیں جیسے شیعہ فقہا شیخ طوسی کو سید الطائفہ کہتے ہیں۔ یہ میانہ رو صوفی سمجھے جاتے تھے۔ وہ صوف کا لباس نہیں پہنتے تھے علماء کے لباس میں رہتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ظاہری لباس کی دل کے معاملات میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

ذوالنوں مصری (م۲۵۰) پہلے صوفی ہیں جنہوں نے تصوف کے مسائل رمز و کنایہ میں بیان کیے اور اصطلاحات کا استعمال کیا تا کہ جو واقف ہیں وہی سمجھیں اور اغیار نہ سمجھ سکیں۔(۲۹) آہستہ آہستہ یہی طریقہ رائج ہو گیا اہل تصوف غزل کی صورت میں یا رمز و کنایہ کے پردے میں مسائل تصوف بیان کرنے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نو افلاطونی فلسفہ

ذوالنون کی ہی کے ذریعے سے تصوف میں داخل ہوا۔(۳۰)

سہل بن عبداللہ تستری صوفیہ کے فرقہ سہلیہ کے بانی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اصل چیز مجاہدۂ نفس ہے۔(۳۱)

اناالحق کے داعی حسین بن منصور حلاج (م۳۰۶) اسلامی دور کے صوفیاء میں سب سے زیادہ متنازعہ شخصیت ہیں ان پر کفر وارتداد اور خدائی دعویٰ کرنے کا الزام لگایا گیا۔فقہا نے ان پر کفر کا فتویٰ جاری کیا اور ان کو عباسی مقتدر کے زمانے میں پھانسی دے دی گئی۔صوفیہ کا خیال ہے کہ ان کے اور بایزید کے جن اقوال سے کفر کی بو آتی ہے وہ سکر و بے خودی کے عالم میں کہے گئے ہیں۔انہیں شہید کہا جاتا ہے۔(۳۲)

این میری شمل حلاج کے بارے میں لکھتی ہیں: ''جب حلاج قید خانہ میں تھے تو کسی نے ان سے پوچھا محبت کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا تم یہ آج کل اور پرسوں دیکھ لوگے۔اور اس دن انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں قلم کر ڈالے، اگلے دن اسے پھانسی دے دی اور تیسرے دن اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی۔''(۳۳)

مستشرقین کی توجہ منصور حلاج کی طرف اتنی زیادہ رہی ہے کہ سب نے اپنے اپنے نظریہ کے مطابق حلاج کی قسمت اور عشق پر تبصرہ کیا کسی نے ان کو وحدت الوجود کا مبلغ قرار دیا اور کسی نے ان پر رازِ عشق عیاں کرنے اور اس کی سزا پانے کا ملزم قرار دیا۔(۳۴) بہر حال حلاج کو آج بھی بہت سے لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔لوئی سینون نے حلاج کی نظموں طواسین کا بغور مطالعہ کر کے حلاج کی سولی کے ہزار سال بعد واضح طور پر دنیا کو بتایا کہ حلاج شہید عشقِ الٰہی ہے اور اس نے محبوبِ حقیقی کے لیے زندگی گزاری اور اسی کے لیے جان دی۔لوئی ماسینون نے حلاج کو تصوف اور عشقِ الٰہی کے باب میں اعلیٰ حیثیت کا حامل قرار دیا ہے اور اس طرح ایک ہزار سال کے بعد اس راز کو دلائل وشواہد سے واضح طور پر عیاں کیا جو دنیائے تصوف کو گومگو میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔(۳۵)

طاوس الفقراء ابونصر سراج طوسی نے کتاب اللمع میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب ایک دوست کی فرمائش پر لکھی تا کہ تصوف کے صحیح اصول وقواعد کی وضاحت کر دوں اور یہ ظاہر کر دوں کہ یہ اصول کتاب وسنت کے مطابق ہیں اور رسولؐ کی اور صحابہ کی اطاعت ان اصولوں کی غایت ہے۔(۳۶)

ابونصر کے بارے میں تذکرۃ الاولیاء میں رقم ہے کہ آپ کے فضائل بیان سے باہر ہیں اور وہ علم وفن، ریاضت اور معاملات، حال ومقال اور تشریح کلمات مشائخ میں کمال رکھتے تھے۔(۳۷)

ابوسعید ابن ابی الخیر کی تعلیمات کے بارے میں ایک بات بہت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ ان میں غیر قرآنی عناصر پائے جاتے ہیں اور اس طرح پانچویں صدی میں جب غیر اسلامی عقائد تصوف میں داخل ہوئے تو اجتہاد اور تحقیق کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے کسی نے ان پر اعتراض بھی نہ کیا کیونکہ اکابر صوفیہ کے خلاف آواز اٹھانا صوفیوں کے

یہاں سوئے ادب سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی آواز بلند کرتا تو اسے یہ مصرع سنا دیا جاتا تھا:

ع خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

(بزرگوں کی غلطی کی طرف اشارہ کرنا (یا غلطی پکڑنا) بھی خطا ہے۔)

اس طرح سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ضعیف اور موضوع احادیث دنیائے اسلام میں رائج ہوگئیں۔ صوفیا محدث یا محقق نہیں اس لیے انہوں نے احادیث کی صحت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہجویری کی تصنیف کشف المحجوب میں بھی ضعیف احادیث پائی جاتی ہیں۔ (۳۸)

نکلسن نے اپنی کتاب Studies in Islamic Mysticism میں ابوسعید ابن ابی الخیر (۹۶۷ء۔۱۰۴۹ء) کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ان کے نام سے پہلا باب لکھا ہے جو ۷۵ صفحات پر مشتمل ہے (اس تفصیل کا ہمارا مقالہ متحمل نہیں ہوسکتا) جس میں فاضل مصنف نے تفصیل سے ان کے روحانی تغیرات اور سیر وسلوک کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مرشد ابوالفضل حسن سرّ خ تھے۔

سلیمی (م ۱۰۲۱ء) نے نہ صرف صوفیا کی سوانح حیات لکھی بلکہ اس عہد میں تصوف میں داخل ہو جانے والے مختلف رجحانات کا بھی جائزہ لیا۔ انہوں نے صوفی خالص اور ملامتی، میں خطِ امتیاز کھینچا۔ فرقہ ملامتیہ نے اخلاص سے مغلوب ہو کر یہ رویہ اختیار کیا کہ عوام الناس کے سامنے جان بوجھ کر ایسے اعمال بجالائے جائے جو مکروہ ہوں تا کہ لوگ انہیں برا بھلا کہیں اور اس طرح وہ اپنے نفوس کی مخالفت آسانی سے کرسکیں اور صبر اختیار کرنے پر اجر وثواب کے مستحق قرار پائیں۔ ہرات کے بزرگ صوفی عبداللہ انصاری (م ۱۰۸۹ء) اکثر اوقات صوفیا کی ملامتیہ روش اور اخلاص کی تعریف کرتے تھے۔ (۳۹) سلیمی کے نصف صدی کے بعد علی ہجویری نے کشف المحجوب میں ملامتیہ رویہ پر کڑی تنقید کی:

> ''ریاکار انسان قصداً ایسے کام کرتا ہے جو اسے عوام میں مقبول کرسکیں اور ملامتی، جان بوجھ کر ایسے کام کرتا ہے تا کہ لوگ اسے دھتکاریں۔ دونوں کے خیالات کا مرکز عوام الناس ہیں اور اس دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ (۴۰) علی ہجویری کے خیال میں ایک مخلص صوفی کا مقصود سوائے رضائے الٰہی کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیے اس لیے یہ دونوں نظریات ناقص ہیں''

رسالہ قشیریہ کے مصنف ابوالقاسم عبدالکریم قشیری (م ۴۶۵ھ) کے بارے میں ان کے ہم عصر شیخ علی ہجویری نے کشف المحجوب میں لکھا ہے ان کی شخصیت عجائباتِ عالم میں سے ہے، اور ان کا مرتبہ بہت رفیع ہے۔ (۴۱) ان کے اشارات بہت لطیف ہیں۔ یہ ابوعلی دقاق کے مرید تھے۔ ان کی یہ تصنیف تصوف کے لیے سرمایہ ناز وافتخار ہے۔

علی ہجویری (م ۴۶۵ھ) جن کو داتا گنج بخش کے نام سے شہرت ملی لاہور میں مدفون ہیں۔ ان کا مزار داتا دربار،

مرجع خاص وعام ہے۔آپ کی تصنیف کشف المحجوب، عالمی شہرت یافتہ کتاب ہے۔صوفیا کا خیال ہے جس کا کوئی مرشد نہ ہواس کے لیے کشف المحجوب کافی ہے۔ان کے بیان میں وقت اور حال کی جو تشریح کی گئی ہے وہ قابل توجہ ہے۔وقت وہ کیفیت ہے کہ اس کیفیت میں بندے کو ماضی اور مستقبل کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔(یوں سمجھو) کہ کوئی واردہ حق تعالیٰ کی طرف سے دل میں آتا ہے اور اس واردہ کی حقیقت بندے کے دل پر منکشف ہوتی ہے تو اس کشف کی کیفیت میں بندے کو نہ ماضی یاد رہتا ہے اور نہ مستقبل کا کوئی خیال پیدا ہوتا ہے۔(۴۲)

حضرت داتا گنج بخش نے وقت اور حال سے متعلق جو تشریح کی ہے اسے محض اصطلاحوں کا فرق خیال کر کے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بنیادی بات دل کو حق کے ساتھ پیوند کرنا ہے اور دوسرے ہر صورت میں حال کو بہتر بنانا ہے۔اس اعتبار سے یہ مسئلہ حاسہ اور ذہن کو مغالطوں میں مبتلا کرنے کا نہیں بلکہ قلب اور روح کو زیادہ سے زیادہ پاکیزہ بنانا ہے۔(۴۳)

کشف المحجوب کی تمام فصلوں میں داتا گنج بخش نے تصوف کے ہر پہلو پر تفصیلی جو گفتگو کی ہے اس سے ان کے کردار پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔وہ اپنے اس لقب سے بیزار تھے اور کہتے تھے۔گنج بخش صرف خدا کی ذات ہے۔۴۳۳ھ میں سلطان سعود کے قتل کے بعد غزنی کے مشہور بزرگ خواجہ ابوالفضل نے اپنے مرید خاص علی ہجویری کو پنجاب کی طرف جانے کا حکم دیا۔وہ ڈیڑھ ماہ کی مسافت کے بعد لاہور پہنچے اور اوائل زمانہ میں درس وتدریس سے منسلک ہو گئے۔علی ہجویری نے ریاضت نفس کشی کے نتیجہ میں جو روشن ضمیری حاصل کی اس کی بدولت آپ پر یہ راز منکشف ہو گیا کہ طالب علم روح سے خالی ہیں۔آپ نے دل برداشتہ ہو کر مدرسہ بند کر دیا اور وعظ ونصیحت کے ذریعے تبلیغ دین کا کام جاری رکھا۔

امام غزالی ۴۵۰ھ میں طوس میں پیدا ہوئے، قرآن وحدیث، علم الکلام، فقہ اور فلسفے میں اپنے زمانے کے علماء اور اساتذہ پر سبقت کی جس پر ۴۸۵ھ میں نظام الملک نے امام غزالی کو مدرسہ نظامیہ میں درس وتدریس کی پیش کش کی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔شیخ الرئس مدرسہ نظامیہ کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود امام غزالی کے دل میں تلاش حق کی جستجو تڑپتی رہی اور انہوں نے عیش وعشرت اور شہرت کی زندگی پر اکتفا نہیں کیا۔شک وشبہات نے انہیں بے قرار کیے رکھا۔آخر کار انہوں نے تصوف کا مطالعہ کیا۔صوفیاء کی تصنیفات اور اساسِ تصوف سے وابستہ ہونے پر امام غزالی شک وشبہ کی پرخار وادی سے نکل آئے اور انہیں وہ دولتِ یقین حاصل ہو گئی جسے وہ تلاش کر رہے تھے۔(۴۴)

امام غزالی نے مسند درس سے استعفیٰ دے دیا اور فقر کے لباس سے آراستہ ہو کر روحانی سفر پر چل پڑے۔زیارات مقاماتِ مقدسہ سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائی۔اس روحانی تبدیلی کے بعد جب نظام الملک کے بے حد اصرار پر آپ نے مسند تدریس دوبارہ سنبھالی تو ان کا انداز مختلف تھا۔امام غزالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے علماء

اورصوفیاء کے درمیان حائل خلیج کو پر کر دیا اور از خود اعلیٰ عہدے کو چھوڑ کر تلاشِ حق میں مصروف ہوئے اور پھر فقر کے ساتھ اسی عہدے پر واپس آئے۔ یہ ان کے کردار کا ایک انوکھا انداز ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حلمی نے امام غزالی کے بارے میں لکھا ہے:

''ان ہی کی شخصیت نے اہل سنت کے گروہ کو تصوف کی طرف مائل کیا اور شک وشبہ کی جو وسیع خلیج فقہ وتصوف کے درمیان پیدا ہوگئی تھی اسے پاٹنے اور دور کرنے میں کامیاب کوشش کی۔ ان ہی کی ذاتِ گرامی کے باعث پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں تصوف کو وہ مرتبہ رفیع حاصل ہوا جو اس سے پہلے عملی اور علمی اور یقینی طور پر حاصل نہیں ہوا تھا۔ غرض ہر جہت سے ان کی شخصیت علم اور تصوف دونوں پر اثر انداز ہوئی اور ان کا بتایا ہوا راستہ مرکز صاحبِ نظراں بن گیا۔''(۴۵) نکلسن ابن العربی کے حوالے سے لکھتا ہے:

ترجمہ: عبادت کا اعلیٰ ترین مرتبہ عشقِ الٰہی ہے۔(۴۶)'' Love is the highest form

''in which God is worshipped.

محی الدین اکبر ابن العربی (م ۱۲۴۰ء) وحدت الوجود کے فلسفہ کے علمبردار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی تصانیف فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ، تصوف کی شہرہ آفاق کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ابن العربی کا کلام عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ان کے سمجھنے کے لیے بہت عرق ریزی کی گئی اور یہ ۲۷ فصوص جو انبیاءؑ کے نام پر ہیں اپنی حیثیت میں دانشِ ربانی کی مظہر ہیں۔ فتوحات مکیہ سے بھی فصوص الحکم کے دقائق پر روشنی پڑتی ہے۔ ابن عربی کے ایک ہم عصر ابن العزیز کا دیوان اگرچہ ادبی حیثیت سے اعلیٰ مقام رکھتا ہے، تاہم اس کی سب سے بڑی خوبی اس مین روحانیت کے مضامین کا پایا جانا ہے۔(۴۷) محی الدین ابن العربی کے بارے میں لطیف اللہ لکھتے ہیں:

''شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہ نے اپنی تصانیف میں نغمۂ توحید ہی کو بلند کیا ہے کہ یہی سچے عاشقوں کی پہچان ہے۔ علمی نقطۂ نظر سے شیخ اکبر نے فلاسفہ اور متکلمین کے غلط تصورات کو صحیح جگہ لانے کی کوشش فرمائی ہے اور توحید کے تنزلی اور صفاتی پہلو کو نصوص کے مطابق پیش کیا ہے۔ چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالم، فلسفہ دان، ادیب اور شاعر تھے اس لیے ان کے بیان میں ضائع، بدائع اور بلاغت کی بوقلمونی ہے۔ ان کے سوا کسی نے توحید کے معارف کو اس شان اور پیرائیہ بیان کے ساتھ اجاگر نہیں کیا۔ بے شک وہ مقبولین الٰہی کے گروہ میں شامل ہیں۔''(۴۸)

عبدالکریم جیلی (۸۳۲۔۱۴۲۸) نے انسان کامل کا نظریہ ابن عربی کے کلام ہی سے کشید کیا ہے تاہم اپنی

تصنیف انسان کامل کے حوالے سے ان کو شہرت ملی۔ نکلسن لکھتا ہے: ''انسان کامل کی خصوصیات میں انسان کامل کا نظریہ پایا جاتا ہے جو ایک علی درجے کی مخلوق ہونے کی وجہ سے نہ صرف قدرت کی توانائیوں کا مظہر ہے بلکہ خدا کی طاقت کا عکس بھی ہے۔''(۴۹)

انسان کامل کا تصور اسلامی تصوف میں حضور اکرمؐ کی ذات مبارکہ کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ حقیقتِ محمدیہ میں انسان کامل کا ظہور صوفیوں کے دل کی آواز ہے۔ اے جے آربری نے بھی اس حوالے سے تین مراحل کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ One-ness (توحید) احدیہ ۲۔ He-ness (تخلیق) ھویہ

۳۔ I-ness (تعین) انایہ

انسان اپنی روح کے حساب سے ایک کائناتی تصور ہے جس نے مادہ کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور جو ذات واجب الوجود کو قدرت کی دنیا سے متصل کرتا ہے۔(۵۰)

اللہ کی تجلی کی روشنی میں انسان اپنی حقیقت سے آشنا ہوسکتا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہی کا مظہر ہو کر انسان کامل کا روپ اختیار کرتا ہے اور پھر اپنی ذات کی نفی کر کے مادہ کی دنیا سے آزاد ہو کر حقیقت اعلیٰ میں فنا ہو کر بقا حاصل کرسکتا ہے۔

انسان کامل کے اس تصور کو بیسویں صدی کے مسلمان فلسفی محمد اقبال اور جرمن فلسفی نطشے نے اپنے کلام میں بہت صراحت کے ساتھ استعمال کیا۔ اقبال کا مردِ مومن اس انسان کامل کا آئینہ ہے یہ مردِ مومن متضاد صفات کا حامل، ہمہ گیر قوت رکھنے والا کراماتی انسان ہے۔ اقبال اس کو امت مسلمہ کا کرداری ہدف سمجھتے ہیں۔

تصوف کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تصورات اور ان کے زیر اثر ایسی تصانیف ظہور پزیر ہوئیں جو تاریخ علم وادب میں گران بہا سرمایہ ثابت ہوئیں۔ فارسی شعراء کے یہاں صوفیانہ مضامین اس شان سے رونما ہوئے کہ تمام دبستان ایک مہکتا ہوا رنگین گلستان بن کر سامنے آیا جس کے خوشہ چینیوں میں جامی، حافظ، سعدی، عراقی، عرفی، نظامی، فیضی، سینائی، عطار، مغربی اور امیر خسرو سب سے بڑھ کر مولانا جلال الدین رومی شامل ہے۔

رومی کے زمانے میں تصوف کو فقید المثال عروج حاصل ہوا ہے مثنوی مولانا روم کو دنیا کے ادبیات عالیہ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ فیہ مافیہ، مناقب العارفین، دیوان ان کے کلام کا حصہ ہیں۔

ابن عربی نے جو کام عربی میں انجام دیا تھا رومی نے وہی کام فارسی میں کر کے دکھا دیا۔ یعنی اب تک تصوف کی بساط پر جو مہرے رقصاں رہے ان سب کو سمیٹ کر اس بازی کو ایسی فتح میں تبدیل کر کے دکھایا جو اور کسی حوالے سے تاریخ ادب میں نظر نہیں آتی۔ رومانویت اور تصوف کا ملاپ اولین دور ہی میں ظاہر ہو چکا تھا اور عشقیہ مضامین محبت کے کنایے، ملفوظات صوفیاء میں نظر آتے تھے اور زلف ورخسار کے استعارے استعمال ہوتے تھے جن کا مخصوص مفہوم ہوتا تھا۔(۵۱)

رومی کے بارے میں اڈریس شاہ لکھتے ہیں: ''رومی کی ایک بے چینی تھی کہ وہ ادبی اور شاعرانہ استعداد میں اپنے تمام ہم عصروں سے بہت آگے تھے جب کہ وہ مسلسل اس بات پر مصر رہتے تھے کہ یہ صلاحیت تصوف (کی اہلیت) کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔''(۵۲)

رومی نے اپنی مثنوی میں جن مضامین کو چھیڑا ہے ان میں سے چند یہ ہیں روح، قلب، عقل، جذبات، روحِ حیوانی، حواس، مناجات، ہمدردی اور اعتراف، سخاوت، عدل اور ظلم، اطاعت، قناعت، کلام، صوفی کیا ہے؟ صوفی کی رہنمائی، فنا اور بقا، قرب، صبر، تسلیم، قضاوقدر، توکل علی اللہ، اخلاص، شکر اور صبر، امید اور خوف، مراقبہ، تنہائی، ذکر اور فنائے ذات، فقر اور زہد، توبہ اور اخلاص عمل، محبت، یقین، توحید اور علم۔(۵۳)

رومی کے نزدیک عشقِ الٰہی قرب و دیدار محبوب کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ محبوبِ حقیقی عبادت گاہوں کے بجائے قلبِ مومن کی پاکیزہ دنیا میں آباد ہوتا ہے۔ مثنوی کا آغاز ہی فراق محبوب کی آہ سے ہوتا ہے۔ رومی اپنے مبداءِ حقیقی سے جدا ہونے پر نالہ و فریاد کرتا ہے اور محبوب کے دیدار کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہے جس میں اپنی انا کی نفی، زہد و تقویٰ عشق کی آگ میں جل کر مر جانا (اور بقا کی منزل پا جانا) شامل ہے۔

رومی کے نالہ درد میں روح انسانی اور ذاتِ الٰہی کا تعلق، فراق و وصال کے مراتب و کیفیات اگرچہ فکر انگیز ہیں۔ لیکن تمام تر عشق اور وجدانی بصیرت پر مبنی ہیں۔(۵۴) رومی کے بارے میں این میری شمل لکھتی ہیں: ''کسی بھی شاعر سے زیادہ رومی عشق کے آفاقی کردار پر زور دیتا ہے کہ عشق سمندر کو کتیلی کے پانی کی طرح کھولا دیتا ہے۔''(۵۵) این میری شمل نے رومی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔(جاری ہے)

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ A. M. A. Shustary, Early Sufis and their Sufism, Adam Publishers and Distributors, Delhi, 2004, p. 1.

۲۔ العنکبوت ۲۹:۶۹۔

۳۔ A. M. A. Shustary, Early Sufis and their Sufism, p. 2.

۴۔ Ibid.

۵۔ علی نقی، شہید انسانیت، امامیہ مشن لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۹۷۔۱۰۱۔

۶۔ علی ابن ابی طالب، نہج البلاغہ، ترجمہ مفتی جعفر، المعراج کمپنی، لاہور ۲۰۰۳ء، ص ۲۵۴۔۲۹۲۔

۷۔ A. J. Arberry, Sufism, Mandall Books Unwine Paper backs, London, Boston, Sydney, 1979, p. 33.

۸۔ مرتضیٰ مطہری، اسلامی علوم کا تعارف، تحقیقات اسلامی پاکستان، مرکزِ تحقیقاتِ اسلامی پاکستان، کراچی، نومبر ۲۰۰۱ء، ص ۲۴۸۔

۹۔ علی ہجویری، کشف المحجوب، ص ۲۷۹ تا ۳۱۳۔

۱۰۔ Anne Marie Schimmel, Mystical Dimensions of Islam, p. 29.

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۱۲۔ (ا) مرتضیٰ مطہری، علمِ عرفان اور تصوّف، اسلامی علوم کا تعارف، ص ۴۸۔

(ب) شیخ ابو طالب محمد بن عطیہ حارثی المکی، قوت القلوب، مترجم: محمد منظور الوجیدی، شیخ غلام علی اینڈ سنز پرائیویٹ لمیٹڈ پبلشرز پاکستان، لاہور، سن ندارد، ص ۹۱۷۔

۱۳۔ مرتضیٰ مطہری، سیر و سلوک، ص ۵۹۔

۱۴۔ علی ہجویری، کشف المحجوب، ص ۳۳۷۔

۱۵۔ A. M. A. Shustary, Early Sufis and their Sufism, p. 5.

۱۶۔ R. A. Nicolson, Studies in Islamic Mysticism, Cambridge University Press, Cambridge, 1989, p. 10-11.

۱۷۔ ایضاً۔

۱۸۔ مرتضیٰ مطہری، اسلامی علوم کا تعارف، ص ۲۴۸ تا ۲۷۰۔

۱۹۔ علی ہجویری، کشف المحجوب، ص ۱۲ تا ۱۶۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۶۔

۲۱۔ لطیف اللہ، تصوّف اور سرّیت، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۸۱۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱۵۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۲۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۸۴۔

۲۵۔ مرتضیٰ مطہری، سیر و سلوک، ص ۱۷۔

۲۶۔ Anne Marie Schimmel, Mystical Dimensions of Islam, p. 55.

۲۷۔ مرتضیٰ مطہری، سیر و سلوک، ص ۵۹۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۶۲ تا ۶۳۔

۲۹۔ ایضاً۔

۳۰۔ ایضاً۔

۳۱۔ ایضاً۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۶۴۔

۳۳۔ Anne Marie Schimmel, Mystical Dimensions of Islam, p. 55.

۳۴۔ ایضاً، ص ۶۴۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۳۶۔ یوسف سلیم چشتی، تاریخ تصوّف، ادارت و پیش لفظ محمد یوسف گورایہ، دار الکتاب، اردو بازار، لاہور، سن ندارد، ص ۳۲۶۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۵۰۷ تا ۵۰۸۔

۳۹۔ Anne Marie Schimmel, Mystical Dimensions of Islam, p. 86.

۴۰۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۴۱۔ یوسف سلیم چشتی، تاریخ تصوّف، ص ۴۷۱۔

۴۲۔ لطیف اللہ، تصوّف اور سرّیت، ص ۸۸۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۸۹۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۲۵ تا ۲۲۶۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۳۱۔

۴۶۔ R. A. Nicolson, Studies in Islamic Mysticism, p. 161.

۴۷۔ لطیف اللہ، تصوّف اور سرّیت، ص ۲۴۱۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۲۵۹۔

۴۹۔ R. A. Nicolson, Studies in Islamic Mysticism, p. 82.

۵۰۔ A. J. Arberry, Sufism, p. 104.

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۵۲۔ Idrees Shah, They Way of the Sufi, Arkana Penguin Books, p. 110

۵۳۔ A. M. A. Shustary, Early Sufis and their Sufism, p. 8.

۵۴۔ لطیف اللہ، تصوف اور سرّیت، ص ۲۷۔

۵۵۔ Anne Marie Schimmel, Mystical Dimensions of Islam, p. 293.